

# گھر اور گھاٹا

عمیرہ احمد





ناولٹ

گھر اور گھاٹا

عمیرہ احمد

”پھر گھاٹا ہوا ہے ..... پورے پچاس روپے کا.....!“ رضیہ نے اپنی کمرخت آواز میں تقریباً چلاتے ہوئے کہا تھا۔ اماں بچتے لے اپنی موٹے شیشے والی نظری عینک سے اپنی بہو کے دھندلاتے وجود کو بے حد بے بسی سے دیکھا اور بڑبڑائی۔

”گھاٹا.....! گھاٹا کیسے ہو گیا.....؟“ اس کے جملے نے جیسے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا، رضیہ بری طرح پسپری تھی۔



اس کی بات پر غور کیے بغیر محسن کے وسط میں رضیہ کی سلائی مشین کے قریب کچھی چادر پر پڑے ان بسکٹ اور ٹافیوں کے ڈبوں کو دیکھ کر بڑبڑاتی رہی۔

”گھانا تو نہیں ہونا چاہیے..... یہ گھانا کیسے ہو جاتا ہے.....؟“ رضیہ نے ڈبے سے سارے کرنسی نوٹ نکال کر انہیں ترتیب سے رکھتے ہوئے کچھ جھڑکنے والے انداز میں اماں سے کہا۔

”جیسے روز ہوتا ہے۔ ویسے ہی آج ہوا ہے..... ویسے ہی کل ہوگا..... تیرا گھانا کہیں ختم ہوتا ہے اماں.....؟“ اماں بختے نے چونک کر اسے دیکھا۔

”میرا گھانا.....؟“ وہ پھر بڑبڑاتی۔ رضیہ اب ڈبے میں پڑے سکے گن رہی تھی اور سکوں کی تعداد دے جیسے اسے کچھ اور ناخوش کیا تھا۔

”سارا دن تو باتیں کرتی رہتی ہے اماں..... اگر منہ کو بند اور آنکھوں کو کھلا رکھے تو یہ گھانا بند ہو جائے گا۔“ رضیہ نے بیٹا آواز میں بڑی بد مزیزی کے ساتھ کہا اور کرنسی نوٹوں کو سلائی مشین کا اوپر والا حصہ ٹھاکر اس میں پھینک دیا سکوں کو اس نے ڈبے میں رہی رہنا دیا تھا۔ اماں نے اس بات پر کچھ نہیں کہا۔ رضیہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”سویرے سویرے کیا شور مچایا ہے..... کیا ہو گیا.....؟“ عبدل تو لیا گلے میں ڈالے مسواک چباتا ہوا اور چپل گھسیٹا اندر کمرے سے نکل آیا تھا۔

”یہ تم اماں سے پوچھو..... کہ کیوں سویرے سویرے تماشا ہوتا ہے اس گھر میں..... آج پھر پچاس روپے کا گھانا ہوا ہے۔“ رضیہ نے اسی تند و تیز لہجے میں عبدل سے کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا اماں کہ تو کرتی کیا ہے..... لوگوں کو چیزیں دیتے ہوئے دھیان سے پیسے کیوں نہیں لیتی..... کوئی دو تین سو چیزوں کا کاروبار نہیں کر رہی..... دس چیزیں بیچ رہی ہے تو..... اور تجھ سے ان دس کا حساب نہیں رکھا جاتا.....؟“ عبدل منہ سے مسواک نکال کر ماں پر چڑھ دوڑا تھا۔ اماں بختے نے

اپنی مونہ شیشوں کی بینک ٹھیک کی۔

”ٹھیک ہی کہتا ہے عبدل..... کوئی سودہ جو چیزیں تھوڑی ہیں، دس چیزیں ہیں..... دس چیزوں میں تو کھانا نہیں ہونا چاہیے مجھے۔“ وہ ایک بار پھر پاؤں میں پہنی ہوئی چپل کو دیکھ کر بڑبڑاتی تھی عبدل اور رضیہ دونوں میں سے کسی نے اس کی بڑبڑاہٹ پر دھیان نہیں دیا۔

”مجھے لگتا ہے یہ خود ہی کھانی رہتی ہے ٹافیاں بسکٹ.....“ رضیہ نے تند و تیز آواز میں الزام لگایا۔

”خود کہاں کھائے گی، چار دانت ہیں اماں کے.....“ عبدل نے پتا نہیں کیا خیال آنے پر ماں کا دفاع کیا۔

”روٹی کھا سکتی ہے ان چار دانتوں کے ساتھ تو ٹافیاں اور بسکٹ بھی کھا سکتی ہے۔“ رضیہ نے ترکی بے ترکی کہا، اماں بختے نے چار پائی پر اپنے برابر بیٹھے چار سالہ سونو کو دیکھا تھا..... شاید اس کوئی اتنے قریب نہیں آتا تھا اماں کے اس لیے وہ چپ چاپ چار پائی پر اماں کے برابر بیٹھا سنجیدگی سے اس سارے جھگڑے کو دیکھ رہا تھا..... وہ خاموش بیٹھا ہی تھا۔

”میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا..... یہ وکانداری اماں کے بس کی بات نہیں.....“ عبدل نے اس بار اپنی بیوی کو جھڑکا تھا۔

”ارے، میں نے کب کہا ہے کہ منافع کم کر لائے..... گھر چلانے کی ذمہ داری تھوڑی سونپ دی ہے اماں کو..... کوئی فائدہ نہ ہو..... پر نقصان بھی تو نہ ہو۔“ رضیہ نے اسی انداز میں کہا۔ عبدل نے اس کی بات نہیں سنی تھی۔

”روز میں، بچپس، پچاس روپے ہاتھ سے جاتے ہیں..... اندر بیٹھی رہتی تو اتنے پیسے تو نہ لگتے اس پر..... اب بیوی سے جھگڑا کر رہا تھا۔

”اندر بیٹھ کر کون سے تیر مار لینے تھے تمہاری اماں نے..... سارا دن چار پائی پر پڑی رہتی تھی..... ہر آنے جانے والے کے ساتھ باتیں کرنے بیٹھ جاتی تھی..... یہ فرمائش ہوتی تھی کہ نی دی لگا دو..... ایسے جیسے نی دی مفت میں چلتا ہے یہ کوئی تاج محل تو نہیں کہ جہاں مرض



میں بیٹھتی..... سلائی اسکول چلا رہی ہوں میں اس  
گھر اور تمہاری اولاد کے لیے..... کہاں بھائی لڑکیوں  
کو..... اگر اماں کو اندر بٹھائے رکھتی تو..... اب کم از کم یہ  
گلی میں بیٹھی رہتی ہے تو گھر میں جگہ تو ہوتی ہے۔“ رضیہ  
بان اسٹاپ بول رہی تھی۔

”تو پھر بھگتو تم ہی..... میں تو اس روز کی بک بک  
اور جھک جھک سے تنگ آ گیا ہوں..... مجھ سے روز روز  
پر انہیں ہوتا یہ گھانا.....“ عبدال بولتا ہونٹن میں بنے غسل  
خانے میں چلا گیا۔

”آج خود آ کر دیکھوں گی کہ کس طرح چیزیں بیچتی  
ہے تو..... دو دفعہ پیسے گن کر ڈبے میں ڈالا کر.....  
سارے عذاب میری جان کے لیے ہیں دو بیٹے اپنی  
بیویوں اور اولادوں کے ساتھ..... کویت میں بیٹھ کر  
ہے ہیں مگر مجال ہے انہیں کبھی ماں کا خیال آجائے.....  
یہ گھانا ہمارے لیے رکھا ہے۔“ رضیہ بولتی ہوئی اندر  
سرے میں چلی گئی۔

اماں کے اندر جاتے ہی سونو پھرتی سے چار پائی سے  
فرار۔ ”اب دکان بھاؤں؟“ اماں نے لگاتار پوچھا۔  
اماں بچتے بچتے سر ہلا دیا۔ یہ روز کا معمول تھا رضیہ  
کی طرح بچی بھکتی منظر سے غائب ہوتی اور سونو اپنا رول  
کرنے لگتا خاموش تماشا کی ایک دم تماشے کا حصہ بن  
جاتا تھا۔

وہ اب صحن کے ایک کونے میں پڑی لکڑی کی بیچ نما  
میز اور اس میز کے اوپر پڑی بوری اٹھائے خوشی خوشی صحن  
بلینز پار کر کے دروازے کے بائیں طرف نالی کے  
میز رکھ رہا تھا۔ میز اپنی مخصوص جگہ پر رکھنے کے بعد  
بے دلیز کے تھڑے کے ایک کونے میں اس تہ شدہ  
صحن پر رکھنے کے بعد اسی طرح بھاگتا اندر آیا اماں بچتے  
بچتے بمشکل ایک ہاتھ سے چار پائی کا سہارا لے کر  
ہاتھ اپنے گھٹنے پر رکھ کر ہانپتی کانپتی کھڑی ہوئی  
سو تب تک اندر آ گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس نے  
ہاتھ پکڑا اور اسے سہارا دیتے ہوئے دروازے  
پر تھم پڑا اماں بچتے اب بھی بڑبڑا رہی تھی۔

جتنی بھی روز گھانا کیوں ہوتا ہے..... یہ زندگی

میں ہر روز ہی کیوں گھانا پڑتا ہے..... کچھ سمجھ میں نہیں  
آتی تھی..... وہ بڑبڑاتے ہوئے بلینز پار کرنے سے پہلے  
سانس لینے کے لیے رکی تھی۔ کھانسی کا ایک دورہ اسے  
پڑا تھا..... چند منٹ وہ وہیں کھڑی جھکی کمر کے ساتھ  
کھانستی رہی..... اس نے اب دروازے کے ایک پٹ  
پر ہاتھ رکھے سہارا لیا ہوا تھا سونو کسی میکانیکی انداز میں  
اماں کے پاس کھڑا اس دورے کے خاتمے کا انتظار کر رہا  
تھا..... یہ روز کا معمول تھا۔ صحن میں اپنی چار پائی سے  
سیاہ دروازے تک آتے آتے اماں یہیں کمرے ہو کر  
کھانستی تھی۔

کھانسی حسب معمول ختم ہو گئی، سونو نے دوبارہ  
اماں کا ہاتھ پکڑا اماں نے دلیز عبور کی اور سونو کی مدد سے  
وہ دلیز کے سامنے بے تھڑے پر بیٹھ گئی۔ سونو ایک بار  
پھر اندر چلا گیا تھا۔ اس دن کسی مشینی انداز میں اماں کی  
چار پائی پر پڑا بستر لیٹا اور اندر برآمدے میں ایک کونے  
میں پڑے صندوق کے اوپر رکھ آیا پھر صحن میں  
آ کر اماں کی چار پائی سیدھی کمر کے دیوار کے ساتھ  
لگا دی اس کے بعد صحن کی دروازے کی زمین پر کچھی  
دوری پر پڑے بسکٹ اور ٹافیوں کے ڈبے اٹھا کر باہر اماں  
کی میز پر جا کر رکھنے لگا یہ اس کا سب سے پسندیدہ کام  
تھا..... دادی کی دکان سیال آباد

اماں بچتے کا نام بچتا اور تھا..... ماں کچھ اور نام رکھنا  
چاہتی تھی لیکن باپ نے بچتا اور رکھا..... کیونکہ بچتا اور کی  
پیدائش پر اسے دو ماہ کی بے کاری کے بعد کام ملا تھا۔  
بچتا اور کے بعد اس کے ماں باپ کے ہاں کوئی اولاد نہیں  
ہوئی لیکن اس کے ماں باپ کے گھر میں کبھی فائدہ بھی نہیں  
ہوا۔ جب تک بچتا اور باپ کے گھر رہی..... باپ کو کبھی  
بے روزگاری کا سامنا نہیں کرنا پڑا..... بیس سال کی عمر  
میں محلے کے سب سے گماؤ لڑکے کے ساتھ اس کی  
شادی ہو گئی تھی۔ شریف درزی تھا اور قریبی بازار میں  
اس کی ایک چھوٹی لیکن اپنی دکان تھی۔ بچتا اور باپ کی  
طرح شوہر کے لیے بھی بچتا اور ثابت ہوئی تھی۔ اس سے  
شادی کے بعد شریف کا کام بڑھنے لگا تھا اور شریف  
جہاں بچتا اور پر فدا تھا وہیں اس بات کا اعتراف بھی



برلا کرتا تھا۔ اوپر نیچے تین بیٹوں کی پیدائش نے جیسے بختاور کے واقعی بختاور ہونے پر غور کیا تھا اور اپنے ماضی کے ساتھ اگر گھائے کا لفظ بختاور کو سمجھ نہیں آ رہا تھا تو سمجھ میں آتا بھی کیوں..... دہ روز گھانا کھاتی تھی اور ہر روز گھائے کی وجہ ڈھونڈنے بیٹھتی تھی..... سارا دن وہ گلی میں بیٹھی بڑبڑاتی رہتی۔

”یہ گھانا کیوں ہوتا ہے.....؟“ یہ گھانا کب ہوتا ہے.....؟ یہ گھانا کون دیتا ہے.....؟ یہ گھانا کیوں نہیں رکھتا.....؟“ اس کے سوال گلی سے گزرتے کسی شخص کے پیر نہیں روکتے تھے..... روکتے بھی کیسے اماں بختے کا گھانا ان کا گھانا تھوڑی تھا..... ان کا گھانا تو ان کے اپنے گھر تھا۔

”بسکٹ لے لوں اماں؟“ سونو نے دادی کی دکان سیٹ کرنے کے بعد بڑے لادے سے اس کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ اجرت“ وہ روز لیا کرتا تھا..... دادی کی دکان سجانے کا معاوضہ۔

”نہر میں خود دیتی ہوں تجھے.....!“ اماں بختے نے کایتے ہاتھ کے ساتھ بسکٹ کے ڈبے کو نولنا شروع کیا۔ ”آج ساری چیزیں اپنے ہاتھ سے دوں گی میں تجھے..... تیری ماں ناراض ہوتی ہے پھر۔“ سونو نے دادی کی بات پر بڑی فرمانبرداری سے سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے.....!“ اماں بختے نے ڈبے سے بسکٹ کا ایک پکٹ نکال کر اسے دے دیا۔

”دیکھ پانی لادے مجھے۔“ اماں نے ساتھ ہی اسے کہا۔ سونو سر ہلاتا بسکٹ کا ریپر کھولتے ہوئے دلہیز سے اندر چلا گیا۔

گلی میں صبح صبح لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ مرد کام پر جا رہے تھے..... بچے اسکول کو..... اور عورتوں نے ہر روز کی طرح صبح صبح گلی کے دروازوں سے باہر جھانکتا شروع کر دیا تھا وہاں سے گزرتے لوگ تالی پر دس ڈیوں کے ساتھ اپنی دکان سجانے اماں بختے کے وجود کے عادی تھے۔ اس کے وجود سے زیادہ اس کی بڑبڑاہٹ کے..... وہ دلہیز پر بیٹھی سارا دن آتے جاتے

لوگوں کو دیکھتے بڑبڑاتی رہتی تھی..... کئی لوگ اسے پاگل سمجھتے تھے..... اور کئی چٹپٹی..... اس کے پاس سے گزرتے والوں کو بھی اس کی باتوں کی سمجھ نہیں آتی تھی..... سمجھ تب آتی اگر کوئی اس کے پاس رکھتا۔ اس لوہے ڈل کلاس محلے کے لوگوں کے پاس اپنے لیے وقت نہیں تھا..... زندگی دو وقت کی روٹی کے لیے نہیں چکی کے دو بانوں میں پھنس رہی تھی..... اس ستر سالہ بوڑھی عورت کے لیے کوئی وقت کیسے نکالنا لیکن پاس سے گزرنے والا ہر شہنشاہ محلے دار اماں بختے کو سلام ضرور کر جاتا تھا۔

جواب چاہے ملتا نہ ملتا۔

اماں بختے کو اب اپنے بچے کا کھانا یاد تھا۔ اپنے سامنے سب ڈیوں کو وہ بے مقصد ٹھیک کر رہی تھی۔ پھر اس نے اس ڈبے کو اٹھا کر گود میں رکھ لیا جس میں وہ بچے ذاتی تھی، ڈبے میں ہاتھ ڈال کر اس نے لکڑی موجود دس بارہ سکوں کو باہر نکال کر اپنی پتھلی پر رکھ لیا۔ وہ شاید رضیہ نے اسے لیے رکھ چھوڑے تھے تاکہ وہ زیادے کے..... مکتے ہوئے ان سکوں کو پتھلی سے ہٹا لے دیتے تھے۔ وہ بڑبڑاتی رہتی تھی۔

”گھائے کی سمجھ نہیں آتی..... گھانا کب ہو؟“ شروع ہوتا ہے..... یہ بھی پتا نہیں چلتا..... وہ اب تیسہ سکوں سے پوچھ رہی تھی۔

”پتلی پر گھانا کب ہوتا ہے انسان کو.....؟“ جب وہ خود پیدا ہوتا ہے.....؟ یا جب وہ اولاد پیدا کرتا ہے.....؟“

”کتنا خوب صورت ہے میرا بیٹا..... شریف اپنی چلی اولاد کو گود میں لیے کھ رہا تھا۔

”خوب صورت..... پورے خاندان میں کسی کا ان گورارنگ نہیں ہے شریف.....“ نیکی سے قہقہہ لگاتے بختاور نے مدھم لیکن فخریہ انداز میں کہا۔

”خاندان کیا..... پورے محلے میں کوئی میرا بیٹے جیسا خوب صورت نہیں ہے.....“ شریف اپنی نو..... اولاد کو دیکھ کر جذباتی ہو رہا تھا۔

”دے دے اس کو مجھے شریف..... تو نظر لگائے

میرے بیٹے کو۔“ بختاور نے اس کی گود سے اپنے بیٹے کو نکالا۔

”میرے بھلی باپس..... بھلا ماں باپ کی نظر تھوڑی تھی ہے اولاد کو.....“ شریف نے ہنس کر کہا۔

”کیا پتا.....؟“ بختاور اب اپنی آنکھ سے انگلی کے ساتھ کاجل لگا کر بیٹے کے ماتھے پر نظر کا دیکھا کر رہی تھی۔

”جو آتا ہے اس کی نظر ہی نہیں بنتی میرے بیٹے سے۔“ میرا تو دل گھبرانے لگا ہے۔“ بختاور نے اپنے بیٹے کو گود میں لیتے ہوئے اپنے دوپٹے سے اس کا چہرہ ڈھانپ دیا۔

اماں بختے کو اب اپنے بچے کی اولاد کو چھپا رہی ہے..... شریف نے برا مانا۔

”پھر تو اس طرح میرے بچے کو مت دیکھ جس طرح تو دیکھ رہا ہے۔“ بختاور نے اٹھ کھڑی کرتے ہوئے کہا۔ شریف بے اختیار ہنسا۔

”اچھا تو آنکھیں بند کر۔“ وہ حیران ہوئی شریف نے اس کی بات پر ہنسی کی۔

”اب یہ آنکھیں بند کر شریف.....“ وہ سہرائی۔

”ارے سمجھ دیتا ہے میں نے تجھے.....!“ شریف کہہ رہا تھا۔

”کیا.....؟ مذاق کر رہا ہے۔“ وہ ہنسی۔

”مذاق کیوں کروں گا..... تو آنکھیں بند کر.....“

”مذاق متاں ہوئی۔“ شریف نے اس کی بات کاٹی۔

”بس آنکھیں بند کر اور ہاتھ آگے کر.....“ بختاور نے ہاتھ پکڑتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر کے ایک ہاتھ اس کے آگے کھول دیا۔

”اماں ایک بسکٹ کا پکٹ دے دے۔“ اماں نے بڑی طرح ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ پتھلی پر اس کے ڈبے میں جا کرے تھے۔ اس کا پہلا گاہک

آئی پہنچا تھا۔ تیس۔ پچیس سالہ وہ آدمی اپنے دو سالہ بچے کو گود میں لے کر اس کا منہ چومتے ہوئے اماں سے کہہ رہا تھا۔ اماں نے بے حد حیرانی سے اس آدمی کا منہ دیکھا..... یوں جیسے اسے سمجھ نہ آ رہی ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

”سونا کیوں شروع کر دیا اماں صبح صبح ہی.....“ اسے گلی میں سونا ہے تو پھر گھر سے ہی دیر سے آیا کر۔ بسکٹ کا پکٹ دے دے ایک.....“ اس آدمی نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ایک پانچ روپے کا نوٹ نکالا۔

”نہ مجھے گھانا نہیں چاہیے۔“ اماں بختے اس کا چہرہ دیکھ کر بڑبڑائی، آدمی نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”کیسا گھانا.....؟ پانچ روپے کا پکٹ ہے.....“

”اس میں گھانا نہیں ہے.....؟“ اماں نے پانچ روپے کے نوٹ کو دیکھ کر کہا۔

”پوری قیمت ہے اماں..... گھانا کہاں ہے..... اب پانچ کا پکٹ چھو میں دے گی۔“ اس آدمی نے ہاتھ تیز آواز میں کہا۔ اماں جیسے ہوش میں آگئی تھی۔ اس نے آدمی کے ہاتھ سے نوٹ پکڑ کر ڈبے میں ڈالتے ہوئے ہم اندر پڑھی۔ یہ اس کی پہلی کمائی تھی۔ بسکٹ کے ڈبے سے ایک پکٹ نکال کر اس نے آدمی کی طرف بڑھایا، آدمی کے ہاتھ بڑھانے سے پہلے ہی گود میں اٹھائے اس بچے نے پکٹ چھٹ لیا۔ آدمی جیسے بچے کی اس حرکت پر بارغ بارغ ہو گیا تھا۔ بے اختیار بچے کے گال چومتے ہوئے اس نے اماں سے کہا۔

”دیکھا اماں کیسا تیز ہو گیا ہے میرا بیٹا.....“ اماں نے کچھ نہیں کہا۔ بچہ بسکٹ کا پکٹ کھولتے ہوئے اس کا پاپ سے باتیں کرنے لگا تھا اور باپ بھی اس کو اٹھائے اس کی باتوں کا جواب دیتے ہوئے چلا گیا۔

اماں اسے جاتا دیکھتی رہی سوتو دونوں ہاتھوں میں پانی کا گلاس پکڑے بڑی احتیاط سے باہر آیا۔

”اماں پانی.....!“ اس نے آتے ہوئے اعلان کیا۔



”اتنی دیر لگا دی پانی لاتے لاتے۔ میری تو پیاس بھی مر گئی۔“ اماں نے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس پکڑنے سے پہلے اپنی عینک مستحالی۔ سوکھنے لگے ایک نظر اماں کے سامان پر ڈالی، اماں اب پانی پی رہی تھیں دو گھونٹ کے بعد اس نے گلاس رکھ دیا اور دوپٹے کے پلو سے اپنے گیلے ہونٹ پونچھے۔

”اماں یہ والی بیل لے لوں۔۔۔؟“ سولو تب تک ایک چیونگم پسند کر چکا تھا۔

”میں خود دیتی ہوں تجھے۔“ اماں نے چیونگم کے ڈبے کو اپنے قریب کرتے ہوئے ٹول کر اس میں سے ایک چیونگم نکال کر سونو کی طرف بڑھائی، سونو نے بے حد خوش ہو کر وہ چیونگم پکڑ لی۔ سیدھا کھڑا ہو کر اس نے ایک سیکنڈ بھی نہیں لگایا تھا چیونگم کا رچرچا تار کر رہا کونالی اور چیونگم کو اپنے منہ میں ڈالنے میں۔

”سونو۔۔۔۔۔ سونو۔۔۔۔۔!“ اندر سے رضیہ نے اسے پکارا تھا۔

”یہ لے۔۔۔۔۔ یہ گلاس بھی لے جا۔۔۔۔۔“ اماں بخت نے اسے جاتے ہوئے ٹوکا۔ سونو نے پڑی فرما بڑھادی سے گلاس اٹھایا۔ اندر موجود پانی خود چڑھایا اور پھر اندر چلا گیا۔

محسن میں آتی رضیہ نے گلاس اس کے ہاتھ میں دیکھتے ہی اسے ڈانٹا۔۔۔۔۔“ بس صبح صبح ہی نوکر بن گیا تو۔۔۔۔۔!“

”اماں کو پیاس لگ رہی تھی۔“ سونو نے بتایا اور تو ماسکی ہے۔۔۔۔۔؟“ رضیہ نے اسے جھڑکا۔

”چل گلاس رکھ کر آ نہلاتی ہوں تجھے۔“ دلہیز پر جیشی اماں بخت نے کھلے دروازے سے بیٹھے بیٹھے پلٹ کر اندر دیکھا رضیہ، سونو کا بازو پکڑے اب اسے غسل خانے کی طرف لے جا رہی تھی اماں نے دوبارہ گردن موڑ لی۔ سر جھکا کر اس نے گود میں پڑے ڈبے میں جھانکا۔۔۔۔۔ سکوں کے درمیان پانچ کا وہ نوٹ پڑا تھا آج کے دن کی پہلی کمائی۔ اماں نے نوٹ کو سیدھا کھانچا پھر اس کی ایک تہ لگا کر اسے دوبارہ ڈبے میں رکھ دیا۔

”انسان کو پہلا کھانا کب ہوتا ہے۔۔۔۔۔؟ جب وہ

خود پیدا ہوتا ہے۔۔۔۔۔؟ یا جب وہ اولاد پیدا کرتا ہے۔۔۔۔۔؟“ لا یا جب وہ پہلا گھر ملتا ہے۔۔۔۔۔؟“ اماں پھر بڑبڑا رہی تھیں۔

”اب آنکھیں کھول۔۔۔۔۔“ شریف نے اس کے ہاتھ پر کچھ رکھتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ بختا در نے بے اختیار آنکھیں کھول کر اپنی ہتھیلی دیکھی، اس کی ہتھیلی پر ایک چابی رکھی تھی۔

”یہ کیا ہے۔۔۔۔۔؟“ اس نے بے حد حیرانی سے شریف سے پوچھا۔

”یہ ہمارے گھر کی چابی ہے۔“ شریف نے بے حد فخریہ انداز میں کہا، بختا در جیسے کرنٹ کھا کر سیدھی ہوئی۔

”پہلے لے گھر کی چابی۔۔۔۔۔؟ تو نے بیعت دے دی۔۔۔۔۔؟“ اس کی آواز شدت سے جذبات سے لرز رہی تھی۔ اس نے چابی منگی میں بھینچ لی تھی۔

”ہاں، میں نے سوچا تجھے اولاد پیدا ہونے پر خوش کر دے۔“ شریف نے بڑے جفا سے کہا۔

”میرے دل کی سزا ہے۔“ دیکھ لے شریف میری اولاد کتنی خوش قسمتی لے کر آئی ہے ہم دونوں کے لیے بختا در نے بے اختیار اپنے بیٹے کو چومتے ہوئے کہا۔

”تو بختا در ہے تو میری اولاد بھی تو بختا در ہی ہوگی۔“ شریف نے جیسے اس کی تائید کی۔

”پوچھانے کے پیسے کہاں سے آئے تیرے پاس۔۔۔۔۔؟“ بیٹے کو چومتے چومتے بختا در کو خیال آیا۔

”وہ سائیکل بیچ دی ہے میں نے اپنی۔“ شریف نے اطمینان سے کہا۔

”ہائے۔۔۔۔۔ سائیکل کیوں بیچ دی؟“ بختا در نے بے ساختہ پریشان ہو کر کہا۔

”گھر سائیکل سے زیادہ ضروری تھا۔ کرایہ کے گھر میں رکھتا تھے ساری عمر۔۔۔۔۔“ شریف بڑا مطمئن تھا۔

”کتنے کی بچی۔۔۔۔۔؟ کھانا ہوا ہوگا۔۔۔۔۔ ابھی تو

اماں نے کچھ تشویش سے کہا۔

”اب اس کی فکر ستانے لگی تھی۔“

”بیل جاؤں گا۔۔۔۔۔ محنت کے لیے اچھا ہوتا ہے۔“ شریف نے ہنس کر کہا۔

”اور پانچ میل چل کر آیا جا یا کرے گا۔“ بختا در کو گناہ سے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

”ابھی تو کہہ رہی تھی کہ میں موٹا ہو رہا ہوں۔ اچھا۔۔۔۔۔“

”شریف۔۔۔۔۔! شریف نے اسے بات مکمل کر دی۔

”ابھی پھوڑا اب یہ بات۔۔۔۔۔ لے لوں گا سائیکل۔“

”تو فکر نہ کر۔“ بختا در چند لمحے اس کی روٹی پھر اس نے منگی کو کچھ اور بھیج لیا۔

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“

”اماں نے بڑے جفا سے کہا۔“



خریدار آنے والا نہیں تھا۔

چند مہینوں میں ہی سچی بات سنی جانے والی انیسویں صدی کی وراثی کم ہونے لگی تھی۔ شروع میں ماں بچتے روز دس پندرہ روپے کمائی لیتی تھی.....! ان دس پندرہ روپے سے اس کے مہینے کے چھوٹے موٹے اخراجات پورے ہونے کے ساتھ کئی بار گھر کی سبزی اور آٹا بھی آجاتا۔ عبدل کو ماں کو اب ہر مہینے کچھ نہیں دینا پڑتا تھا۔ دوسری طرف رضیہ اس لیے خوش تھی کہ وہ چار پائی والی جگہ کو استعمال کر رہی تھی..... سلائی اسکول میں وہ دو اور لڑکیاں لے سکتی تھی کیونکہ گنجائش کھل آتی تھی پھر آہستہ آہستہ ماں کا منافع کم ہونے لگا..... پہلے منافع کم ہو پھر ختم ہو گیا۔

کچھ عرصے تک دکان بغیر منافع کے چلتی رہی۔ پھر گھانا ہونے لگا تھا..... دو روپے، چار روپے..... اور اب یہ گھانا بڑھ کر کبھی کبھار پچاس روپے تک بھی چلا جاتا تھا۔ عبدل کو ہر مہینے ایک بار پھر ماں بچتے کی دکان میں پیسے ڈالنے پڑتے تھے..... گھر میں جو بنگاہ ہوتا وہ الگ..... رضیہ ہر روز آسمان سر پر ضرور اٹھاتی لیکن وہ ماں کی دکان ختم کرنے پر تیار نہیں تھی۔ دکان ختم کرنے کا مطلب ماں کی گھر کے اندر چار پائی کے ساتھ واپسی تھی اور اس چار پائی کے دوبارہ بچنے کی صورت میں اسے کم از کم دو لڑکیاں اسکول سے کم کرنی پڑتیں..... اور دو لڑکیاں کم کرنے کا مطلب ماہانہ دو تین ہزار روپے کا گھانا تھا..... ماں کی دکان سے ماہانہ ہونے والا گھانا چھ سات سو تھا..... دکان کے کھانے کے ساتھ بھی ماں کا گھر سے باہر دھار رضیہ کے لیے کھانے کا سود نہیں تھا۔

”اماں، چائے لے لو.....“ سولو ایک کپ پکڑے بڑی احتیاط سے دلہیز پار کرتا باہر آیا۔

”نصیر میں پکڑی ہوں۔“ اماں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس سے کپ پکڑا سولو اماں کے پاس دلہیز پر بیٹھ گیا۔ وہ نہا کر آیا تھا اور رضیہ نے ٹیل لگا کر اس کے بالوں کی مانگ نکالی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں میں سرمہ لگایا تھا پھر سرمے سے ہی نظر کا ایک ٹکا اس کے ماتھے پر بھی لگا دیا تھا۔

سولو بڑی منتہی مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔

چار بیٹیوں کے بعد اس کا ایک بھائی اور دو بھینس کا اگوتا ملا تھا۔ یہ سلائی اسکول سولو اور بچوں کو انگلش میڈم اسکول میں پڑھانے کی خواہش کے لیے محرش میں آ گیا تھا۔

”یہ والی ثانی دوٹا اماں.....! سولو نے پاس بیٹھے ہی دانیوں کے ڈبے میں جھانکتے ہوئے ایک ثانی پر انگلی رکھی۔

”نصیر بے صبر ہے میں خود دیتی ہوں تجھے..... اماں نے پوچھے منہ کے ساتھ ہنس کر اس سے کہا۔ پھر چائے کا کپ رکھ کر اس نے ثانی دانی اور سولو کو دیکھا۔

”نہا کر کتنا بھانگتا رہا ہے میرا بچہ۔“ چائے کا کپ دوبارہ اٹھاتے اٹھاتے اماں کو سولو پر پیارا آیا۔ ثانی کا سر گھولنے میں مصروف تھا اس نے اماں کی محبت پر غور نہیں کیا۔ اماں کپ اٹھا کر سٹرک سٹرک کر کر کے چائے پیتے لگی۔ بس رضیہ اس معاملے میں اچھی تھی کہ اس نے چائے پیتے ہی تو اماں کو نصیر پوچھے ایک کپ کھائے۔

”سلام اماں.....“ اماں کے پاس سے سلائی اسکول کی دو اور بچیاں گزری تھی پھر سولو بھی یک دم کم ہو گیا۔

”تو کہاں جا رہا ہے؟“ اماں نے چائے پیتے اسے ٹوکا۔

”میں گھر جا رہا ہوں۔“ دلہیز نے گھر کے بونے چوستے ہوئے اس نے اعلان کیا اور گھر کی دلہیز نہ کر لی۔ اماں اس دلہیز کو دیکھتی رہی جیسے چند لمحوں پہ اس کے بچوں نے صبر کی تھی۔

”اندرا چل.....“ یہاں کیوں کھڑی ہے.....؟“ شریف نے اسے ٹھوکا دیا۔

”مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا شریف کہ میں اس کے دروازے پر کھڑی ہوں.....“ سچ بتا یہ کوئی خواہش نہیں ہے۔“ بختاوردی کی آنکھیں اب پانی سے بھر رہی تھیں۔

”میرا خوشی سے جیسے بے قابو ہو رہی تھی۔“

”کوئی خدائے نکل ہے۔“ بچتے اپنا ہی گھر ہے۔ اندر چل.....“ شریف اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دروازے سے اندر لے آیا تھا۔

دو کمرے، برآمدے ایک غسل خانے اور ایک کھوٹے سے صحن کا وہ ساڑھے تین مرلے کا گھر اس وقت بختاوردی کو تاج محل سے کم خوب صورت نہیں لگ رہا تھا..... کیونکہ وہ اس کا گھر تھا..... اپنا گھر..... صحن کے وسط میں کھڑی وہ جیسے خوشی سے بے قابو اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھے سامنے برآمدے اور اس کے پار دونوں کمروں کے بند دروازوں کو بے یقینی سے دیکھتی رہی۔

”میری ماں کو پچاس سال کی عمر میں اپنا گھر نصیب ہوا اور دیکھو شریف میں تو ابھی پچیس سال کی بھی نہیں ہوئی اور اپنے گھر میں کھڑی ہوں اس نے شریف سے کہا۔“ شریف جواباً کچھ اداسی سے مسکرایا۔

”اور کھڑی میں کچھ سادگی عمر اپنا گھر نصیب نہیں ہوا۔“ شریف نے کہا۔ ”میری ماں کو گزشتہ سال اپنی اپنی قسمت ہے بچتے۔“

بختاوردی کی بات سننے بغیر اب گھر کے کمروں میں امانہ دار جا جا کر دیکھ رہی تھی۔ شریف کو اس کی خوشی دیکھ کر ہنسی آرہی تھی وہ تو بالکل ہی دیوانی ہوئی تھی۔ دو کمرے، برآمدہ، باورچی خانہ، غسل خانہ، صحن، چھت۔

”میرے بھائی کیسے بھاگ لگا دیے تو نے.....“ وہ اس سے بے قابو ایک ایک چیز کو نکلنے میں مصروف تھی اس کا بس چلنا تو گھر کی اینٹیں تک کن ڈالتی۔

”ہاں بس اللہ کا کرم ہے..... کچھ مرمت ہونے لگی ہے۔“ بچھلا مالک مکان بتا رہا تھا کہ برسات میں اس کی مٹی ہیں..... برآمدے کا فرش کچا ہے..... اور کچھ مہاں ٹوٹی ہوئی ہیں پر باقی سب ٹھیک ہے۔“

”میں اپنی یہ چوڑی بچ دوں گی، تو اسے بچ کر لے کر آؤ۔“ بختاوردی نے بے اختیار اسے پیش کش کی۔

”اس نے اسے ٹوکا۔“

”ایک ہی قہقہہ بڑی ہے تیرے پاس وہ بھی بچ دے گی۔“

”تو کیا ہوا.....؟“ بختاوردی نے بے پروائی سے کہا۔ ”تو پہنے گی کیا.....؟“ شریف کو اب بھی تشویش تھی۔

”کالج کی چوڑیاں.....“ ایک نہیں ڈھیر ساری.....!“ بختاوردی نے ہنستے ہوئے چوڑی اتاری اور شریف کے ہاتھ پر رکھ دی۔

”پر سونا بچ کر ہمیشہ کھانا ہوتا ہے.....“ شریف نے چوڑی کو دیکھ کر کہا۔

”کتنا گھانا ہو جائے گا.....؟“ بختاوردی نے کچھ تشویش سے پوچھا، شریف چوڑی کو دیکھنے لگا اور چوڑی بے اختیار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔

●●●

تراقی کی آواز کے ساتھ کپ اماں کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گرا اور دو ٹکڑے ہو گیا..... اماں بچتے بے اختیار جیسے چونک کر حال میں آتی تھی۔ تبھی سولو گھر سے نکل آیا اس نے بے حد تشویش سے جھک کر اماں کے قدموں میں پڑے کپ کے ٹکڑے اٹھائے اور کہا۔

”کپ ٹوٹ گیا اماں.....؟“

”ہاتھ سے چھوٹ گیا سولو.....!“ اماں نے فق چہرے کے ساتھ کہا۔

”پر اماں نے تو کپ لینے کے لیے بھیجا تھا مجھے.....؟“ سولو اب پریشان ہو رہا تھا۔

”یہ تمکو کا پیکٹ لے لے اور تو اماں سے کہہ دینا کہ تجھ سے ٹوٹ گیا ہے۔“ اماں نے میز پر پڑا تمکو کا ایک پیکٹ اٹھا کر اسے تھماتے ہوئے بڑی لجاجت کے عالم میں کہا۔

”اچھا میں کہہ دوں گا.....“ سولو نے خوشی خوشی وہ پیکٹ لے لیا اور کپ کے ٹکڑے ہاتھ میں لیے اندر چل دیا۔

صحن میں لڑکیوں کو سلائی سکھاتی رضیہ نے کپ کے ٹکڑوں کے ساتھ سولو کو اندر آتے دیکھا اور وہ وہیں بیٹھے بیٹھے چلائی۔ ”اس بڑھیا نے کپ تو ڈر دیا.....؟“

●●●



”نہیں اماں، یہ تو میرے ہاتھ سے ٹوٹا ہے۔“  
سونو نے نمکو کا پیکٹ دانتوں سے کھولتے ہوئے بڑی صفائی سے جھوٹا بولا۔ رضیہ کا پارہ صفائی سے اڑا کر لیا تھا اس سے زیادہ تیزی سے نیچے آیا۔  
”تو بھی بس..... چل کوڑے کی ٹوکری میں پھینک اس کپ کو..... ذرا سا بچہ ہے اب روز روز جانے ڈھونڈے تو کپ تو ٹوٹے گا ہی اس سے۔“ رضیہ نے پاس بیٹھی لڑکیوں سے کہا پھر ساتھ ہی دوڑتی ہوئی ایک قیس کا تکی ٹوکی کوڈ اٹھا۔  
”یہ کیسے کاٹ رہی ہے تو..... قیس بنانی ہے یا رضا کی بنانی ہے تو نے.....؟“ سونو کپ پھینک کر نمکو کھا تا رضیہ کی گود میں آکر بیٹھ گیا اور زبردستی اس کے منہ میں نمکو ڈالنے لگا۔ رضیہ نے نمکو کے چند دانے چباتے ہوئے بڑے پیار سے اکلوتے بیٹے کا منہ چوما۔ سونو نے جواباً اس کا منہ چوما۔

عبدال اسی وقت کام پر جانے کے لیے اندر سے لٹکا۔ رضیہ کی گود میں بیٹھے سونو کو اٹھا کر اس نے اس کا منہ چوما پھر چلتے ہوئے دھڑلے کے پاس اسے اتار کر وہ دھڑلے پر بیٹھی اماں بختے کو سلام کیے بغیر تیز قدموں سے گھر سے نکل گیا۔ اماں بختے نے خود اسے سلام کر کے دعا دی تھی۔ ”اللہ حافظ! خیر سے جا خیر سے آ۔“ عبدال نے پیچھے پلٹ کر جواب دینے یا دیکھنے تک کی زحمت نہیں کی تھی۔ اماں بختے جب تک عبدال کو دیکھتی رہی جب تک اس کا دھندلا وجود دیکھتی کا موڑ نہ مڑ گیا۔

شریف نے چونک کر کھانا کھاتے ہوئے اس کا غد کو دیکھا۔ جو بختاور نے اسے ہنگامہ جھلٹے جھلٹے اچانک اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ ”یہ کیا ہے.....؟“  
”میں نے آج گھر کی مرمت اور دوسری چیزوں کا حساب لگایا ہے..... وہ ساری چیزیں جو گھر میں ہونے والی ہیں۔“ بختاور نے اسے بتایا۔ کھانا کھاتے کھاتے اپنی انگلیاں چوس کر صاف کرتے ہوئے شریف نے وہ کاغذ اٹھا کر کچھ محسوس کے عالم میں پڑھا۔ اس کے ہاتھ پر کچھ مل آگئے تھے۔

”یہ تو بڑے پیسے لگ جائیں گے بختے..... چوڑی سچ کر اسے پیسے تو نہیں ملیں گے۔“ اس نے کچھ ٹھوٹے سے کہا۔  
”بتا ہے مجھے۔ اس لیے میں نے سوچا ہے اہل بالیاں اور شادی کی انگوٹھی بھی بیچ دوں۔ زیور کا کیا ہے زیور تو آہی جاتا ہے۔“ اس نے بے حد اطمینان کے ساتھ کہا۔  
”پر بختے ابھی مکان کی قسطیں جانی ہیں۔ مرمت پر سارا پیسہ لگا دیں گے تو..... تو قسطیں کہاں سے دیں گے۔ اگر زیور بیچنا ہی ہے تو قسطوں کے پیسے دے دیں ہیں۔ مرمت تو میں اور تم مل کر تھوڑی تھوڑی کماتے رہیں گے۔“ بختاور ایک دم کچھ مایوس ہوئی۔  
”خود کیسے کریں گے مرمت.....؟“

”چلی تو نہ کرنا میں کروں گا۔ چھٹی والے دن شروع کرتا ہوں کام۔“ شریف نے فوراً کہا۔  
”ایک چھٹی کا دن ہی ہوتا ہے تیرے پاس آرام کرنے کے لیے..... وہ بھی کام میں ضائع کر دے گا۔“ بختاور نے کھانا کھاتے کھاتے کہا۔  
”نہیں تو بڑے سوچتے ہوئے تھا۔“  
”تو بچہ سنبھالے گی یا یہ کام کرے گی۔ میں جب کام کروں گا تو تو ساتھ ساتھ ہاتھ بٹا دینا میرا۔“ اس طرح بچے کو چھوڑ کر گھر کی مرمت پر دھیان دے..... دیکھ وہ شاید جاگم گیا ہے۔ ذرا لے کر اسے میرے پاس۔“ بات کرتے کرتے شریف نے پچھوڑے میں حرکت دیکھی۔

”ایک غبارو لے لوں اماں.....؟“ سونو نے اسے چوکایا۔ وہ ایک غبارہ ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔  
”چل لے لے۔“ ہوا بھر کے دیکھا مجھے۔“ اماں نے بڑے شوق سے اپنی عینک ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ سونو بڑی پھرتی سے غبارے میں ہوا بھرنے کا غبارے میں آدمی ہوا پھر کر اس نے اماں کے سامنے کیا۔ اماں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ غبارے کو ہاتھ

کر دیکھا۔  
”یہ تو بڑے پیسے لگ جائیں گے بختے..... چوڑی سچ کر اسے پیسے تو نہیں ملیں گے۔“ اس نے کچھ ٹھوٹے سے کہا۔  
”بتا ہے مجھے۔ اس لیے میں نے سوچا ہے اہل بالیاں اور شادی کی انگوٹھی بھی بیچ دوں۔ زیور کا کیا ہے زیور تو آہی جاتا ہے۔“ اس نے بے حد اطمینان کے ساتھ کہا۔  
”پر بختے ابھی مکان کی قسطیں جانی ہیں۔ مرمت پر سارا پیسہ لگا دیں گے تو..... تو قسطیں کہاں سے دیں گے۔ اگر زیور بیچنا ہی ہے تو قسطوں کے پیسے دے دیں ہیں۔ مرمت تو میں اور تم مل کر تھوڑی تھوڑی کماتے رہیں گے۔“ بختاور ایک دم کچھ مایوس ہوئی۔  
”خود کیسے کریں گے مرمت.....؟“

”چلی تو نہ کرنا میں کروں گا۔ چھٹی والے دن شروع کرتا ہوں کام۔“ شریف نے فوراً کہا۔  
”ایک چھٹی کا دن ہی ہوتا ہے تیرے پاس آرام کرنے کے لیے..... وہ بھی کام میں ضائع کر دے گا۔“ بختاور نے کھانا کھاتے کھاتے کہا۔  
”نہیں تو بڑے سوچتے ہوئے تھا۔“  
”تو بچہ سنبھالے گی یا یہ کام کرے گی۔ میں جب کام کروں گا تو تو ساتھ ساتھ ہاتھ بٹا دینا میرا۔“ اس طرح بچے کو چھوڑ کر گھر کی مرمت پر دھیان دے..... دیکھ وہ شاید جاگم گیا ہے۔ ذرا لے کر اسے میرے پاس۔“ بات کرتے کرتے شریف نے پچھوڑے میں حرکت دیکھی۔

”ایک غبارو لے لوں اماں.....؟“ سونو نے اسے چوکایا۔ وہ ایک غبارہ ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔  
”چل لے لے۔“ ہوا بھر کے دیکھا مجھے۔“ اماں نے بڑے شوق سے اپنی عینک ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ سونو بڑی پھرتی سے غبارے میں ہوا بھرنے کا غبارے میں آدمی ہوا پھر کر اس نے اماں کے سامنے کیا۔ اماں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ غبارے کو ہاتھ

کر دیکھا۔  
”یہ تو بڑے پیسے لگ جائیں گے بختے..... چوڑی سچ کر اسے پیسے تو نہیں ملیں گے۔“ اس نے کچھ ٹھوٹے سے کہا۔  
”بتا ہے مجھے۔ اس لیے میں نے سوچا ہے اہل بالیاں اور شادی کی انگوٹھی بھی بیچ دوں۔ زیور کا کیا ہے زیور تو آہی جاتا ہے۔“ اس نے بے حد اطمینان کے ساتھ کہا۔  
”پر بختے ابھی مکان کی قسطیں جانی ہیں۔ مرمت پر سارا پیسہ لگا دیں گے تو..... تو قسطیں کہاں سے دیں گے۔ اگر زیور بیچنا ہی ہے تو قسطوں کے پیسے دے دیں ہیں۔ مرمت تو میں اور تم مل کر تھوڑی تھوڑی کماتے رہیں گے۔“ بختاور ایک دم کچھ مایوس ہوئی۔  
”خود کیسے کریں گے مرمت.....؟“

شریف کی طرح تھکی ہوئی تھی۔ مگر تو خیر نے لیا تھا ان کی باتوں کے لیکن سگایا اب ان دونوں کو بے حال کر رہی تھیں۔  
”اجا میں بات کمروں کا کل کسی سے۔ رات کا کوئی کام مل جائے۔ چار پارچے گھنٹوں کا تو..... کچھ پیسے تو مل جائیں گے۔“ شریف نے کچھ سوچ کر کہا۔  
”میں نے بھی حمیدہ سے کہا ہے کہ مجھے بھی لفافے بنانے کے لیے لا دیا کرے سارا دن فارغ رہتی ہوں۔“  
”نہیں۔“ کچھ روپے تو آئی جائیں گے اور کچھ نہیں تو سب کے بسکٹ اور دوادار دے کے پیسے تو نکل ہی آیا کریں گے۔“ بختاور ہر رات کی طرح اس وقت بھی بیٹھی حساب کر رہی تھی۔ شریف کچھ کہے بغیر چار پائی پر لیٹ گیا۔ بختاور نے چونک کر اسے دیکھا۔

غبارہ ایک دھماکے کے ساتھ پھٹا تھا۔ اماں بختے ہڑ بڑا گئی۔ اس کی ناک پر کچی عینک گرتے گرتے پڑی۔ پہلے بھی وہ عینک دو تین دفعہ گری تھی اور اس کے مونے ٹھٹھے ایک دو جگہ سے تڑخ گئے تھے۔ اس کے فریم کا ایک کنارہ بھی ٹوٹ گیا تھا جسے رضیہ نے شیب اور اچھا لگے لپسٹ گر جوڑا تھا۔ دھندلا نظر تو اماں کو پہلے بھی بھشکل آتا تھا۔ اب عینک کے شیشوں میں چند لکیریں اور بڑھ گئی تھیں تو کیا۔ نیا شیشہ بھی ڈال دیا جاتا تب بھی باں کی آنکھوں کی لکیریں اور دھندلا ہٹ کہاں ختم ہوتی تھی۔

”دیکھا اماں پھٹ گیا تاں.....! میں نے پہلے ہی کہا تھا۔“ وہ سونو تھا جس نے اماں کے کہنے پر غبارے میں مزید ہوا بھرنے کی کوشش کی تھی اور غبارہ پھٹ گیا۔ اماں بختے نے کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ ایک اور غبارہ نکال کر اسے دیتے ہوئے پکارا۔  
”میرا بچہ۔“ فکر گئیوں کرتا ہے..... بڑے غبارے پڑے ہیں..... یہ لے لے۔“ سونو نے خوشی خوشی اماں سے غدارہ پکڑ لیا۔  
”کھانا لا کے دوں.....؟“ اس نے ساتھ ہی پوچھا۔ اماں نے سر ہلا دیا۔ سونو بھاگتے ہوئے اندر چلا



گیا تھا ماں نے ایک باز بھر گلی میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ابھی تک کچھ نہیں کیا تھا اس نے ایک نظر دوبارہ پیسوں والے ڈبے کے اندر ڈالی۔

●●●

”سلام بختے.....“ حمیدہ نے دروازہ کھول کر اندر آتے ہوئے کہا۔ بختاور محسن میں ٹھنی لفافے جوڑ رہی تھی اور ساتھ ساتھ جھولے میں پڑے بچے کو جھلا رہی تھی۔ ”وعلیکم السلام..... آج صبح صبح کیسے آگئی حمیدہ.....؟“ بختاور نے جواباً پوچھا۔ ”محلے کی عورتیں مینا بازار چل رہی ہیں میں نے سوچا تجھے بھی پوچھ لوں۔“ ”نہیں حمیدہ، مجھے تو بڑا کام ہے۔“ بختاور نے فوراً کہا۔

”وہ سب کو ہی ہوتا ہے۔ کون سا روز جانا ہے ہمیں..... کبھی کبھار گھر سے لٹکانا چاہیے بختے.....!“ ”پر مجھے ابھی منے اور شریف کے کپڑے دھونے ہیں۔ لفافے رستے بھی دوں تو بخترے کام میں آج بھی بختاور نے صاف انکار کر دیا۔ ”شوہر، مگر اور نیچے کسی کو کچھ نہیں ہوتا..... سب یہیں رہتے ہیں..... عورت کے پاس کچھ وقت اپنے لیے بھی ہونا چاہیے۔ گھر اور بچوں کے لیے تو ساری عمر ہی جان ماری ہوئی ہے۔“ حمیدہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اس کے لفظوں نے بختاور پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔

”ہاں مگر میرے پاس پیسے بھی نہیں ہیں۔ مینا بازار آنے جانے کا کرایہ وہاں کھانا پینا..... کچھ خریدنا..... نہ حمیدہ میرے پاس پیسے نہیں۔“ بختاور نے اپنی مشکل بتائی۔

”ارے تو، تو مجھ سے ادھار لے لے۔ بعد میں دے دینا..... پہلے بھی تو گھر اور بچے کے لیے ادھار لیتی رہی ہے..... اس بار اپنے لیے لے لینا.....“ حمیدہ نے فوراً پیش کش کی۔ لفافہ جوڑتے جوڑتے ایک لمحے کے لیے بختاور کے ہاتھ رکے پھر اس نے یک دم کہا۔

”نہیں حمیدہ، اپنے لیے ادھار نہیں لے سکتی۔“

تو خراگشتا ہے۔“ حمیدہ نے کچھ حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

●●●

”اماں تو سو رہی ہے کیا.....؟“ وہ سونو کی آواز پر ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔ وہ اس کے قریب جھکا مدھم آواز میں بڑے پراسرار انداز میں پوچھ رہا تھا۔ ”نہیں..... نہیں سو کہاں رہی ہوں..... ایسے ہی آگے لگ گئی.....“ اماں بختے نے فوراً صفائی دی۔ ”اماں نے کہا تھا کہ دیکھ کر آئیں تو سو تو نہیں رہی..... کوئی چیز اٹھا کر لے گیا تو گھانا ہوگا.....“ سونو نے اتنی مدھم آواز میں کہا جیسے وہ اپنی اوداماں کی گفتگو کر رہا ہے۔

”بتا سہجے..... اب تو اماں سے مت کہنا..... یہ وال سوئیاں لے لے۔“ اماں نے فوراً ایک کاغذ پر کچھ سوئیاں رکھتے ہوئے اسے پکڑا لیا۔ ”اور کھانا نہیں لایا تو.....؟“ اماں کو سوئیاں پکڑاتے ایک کام یاد آیا۔ ”اے کھانا پکھا لیں..... اماں نے ہاتھ دیکھ کر کہا۔ ”سونو نے بڑے مزے سے منہ میں وال سوئیاں ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ سوئیاں کھاتے ہوئے کہہ کے اٹھ بیٹھا گیا۔

”کیوں چھو رہی تھی نا بڑھیا.....؟“ رضیہ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ وہ بیٹی کے کپڑے اکاٹ رہی تھی۔

”نہیں تو..... وہ تو جاگ رہی گی۔“ سونو نے اطمینان سے جھوٹ بولا۔

”سچ کہہ رہا ہے؟“ رضیہ نے کچھ ٹٹولنے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”اور کیا..... یہ کھاؤ اماں.....“ سونو نے ساتھ ہی چند سوئیاں رضیہ کے منہ میں ڈال دیں۔ رضیہ تو بیٹے کے اس لاڈ پر جیسے قربان ہو گئی تھی۔

”میرا چاند..... میرا لعل..... آ میرا سونو..... میری گود میں آ کے..... تھک گیا ہوگا.....“ رضیہ نے اسے زبردستی اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں تھکتا.....“ سونو نے اطمینان سے

برہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں تو ہو بڑا بیواں ہے تو کیوں تھکے گا.....؟“ رضیہ نے ہنستے ہوئے اس کے بالوں میں ہاتھ کھیرا۔

”لیٹ جا اماں کی گود میں.....“ رضیہ نے زبردستی اسے لٹا کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ سونو نے آنکھیں بند کر لیں چند لمحے وہ اسی طرح ساکت لیٹا رہا پھر ایک دم اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”پر میں سو گیا تو اماں کو کھانا کون دے گا.....؟“ رضیہ نے اسے بے حد فطنتی سے ایک جیت لگائی۔

”دادی کا کتنا سگا بنتا ہے..... سو جا چپ کر ناخوش ہو کر کچھ دیر ماں کے پاس لیٹا رہا پھر رضیہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی اور سونو جھکے سے اٹھ کر پھر گھر سے باہر آ گیا۔

”جا سونو کتنی اور شیشہ لے کر آ.....“ اماں بختے نے اسے دیکھتے ہی فریادیں کی، وہ روز واپس پر ہی پچھ کر گھر آیا۔ دیران بالوں کو سنوارا کرتی تھی جو صبح ہی اس کی نگاہ سے ہو چکے تھے۔ سونو ایک آئینے میں اندر سے شیشہ اور کھانے لایا لیکن اس بار اس نے اس کا کام لے لیا۔ عدا غصہ طلب نہیں کیا تھا۔ اپنی گود میں کھٹکھٹا اور شیشہ رکھ کر اماں بختے آہستہ آہستہ اپنے کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ اپنے سفید بالوں کی وہ بے ترتیب سی چٹیا کھانے لگی تھی جواب آدھے فٹ سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔

”اماں ہاں کھول کر اس نے آہستہ آہستہ بالوں میں لٹکھا چلانا شروع کر دیا تھا سونو اس کے پاس بیٹھا اسے شوق سے اسے بالوں میں کٹکھٹا کرتے دیکھ رہا تھا۔ اماں بختے نے سونو کو شیشہ تھماتے ہوئے کہا۔

”لے سونو، ذرا شیشہ پکڑ..... میں چٹیا کروں.....“ سونو نے خوشی خوشی شیشہ پکڑ لیا۔ اماں نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا اس کے ہاتھ ختم گئے۔

●●●

”اور کمرے کی دیوار پر لگے آرائشی شیشے میں اپنے کمرے کا عکس دیکھ رہی تھی ابھی شریف کمرے

میں آیا اور اسے شیشے کے سامنے کھڑے دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا دیکھ رہی ہے بختے.....؟“ بختاور نے چونک کر اسے دیکھا پھر وہ سگرائی۔

”شیشے سے دیوار کیسی سچ گئی ہے شریف.....؟“ ”ہاں.....!“ شریف نے اپنی قمیص کی آستینیں اوپر کرتے ہوئے کہا۔

”اتنا سستا شیشہ مارا یہ..... حمیدہ کو تو یقین ہی نہیں آیا جب میں نے اسے اس کی قیمت بتائی.....!“ وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے بڑی احتیاط کے ساتھ شیشے کو صاف کر رہی تھی۔

”میں تو شکر ادا کرتا ہوں کہ قسطیں ختم ہو گئی ہیں..... مگر پر قرضہ نہیں ہے اب.....“ شریف نے ٹرنک کھولتے ہوئے کہا۔

”ہاں، اللہ کا شکر ہے..... قرضہ ختم ہو گیا ورنہ کیسے جان عذاب میں رہتی تھی ہماری.....“ بختاور شیشہ صاف کرتے کرتے ایک لمحے کے لیے رکی اور اس نے جیسے سکون کا سانس لیا۔ شریف نے ٹرنک سے کچھ نوٹ گن کر نکالے اور بختاور کو دیے۔ ”یہ کیا.....؟“ وہ حیران ہوئی۔

”اپنے لیے کپڑے بنوائے..... پورا سال ایک جوڑا بھی نہیں بناتا تیرا.....“ شریف نے بڑے پیار سے اسے کہا تھا۔ بختاور نے کچھ شکرگزاری سے اس کے ہاتھ سے نوٹ پکڑ لیے آخری بار تیا جوڑا کب پہنا تھا اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

●●●

”اماں ہاتھ تھک گئے میرے اب بس کرو.....“ سونو نے ایک پاؤں سے دوسرے پاؤں پر اپنا وزن منتقل کرتے ہوئے شیشہ پکڑے پکڑے کچھ بیزارگی سے کہا۔

”ہاں، ہاں..... میں..... میں بس کر رہی ہوں.....“ اماں نے چونک کر اپنی چٹا گوندھنا شروع کی۔ اس کے کپکپاتے ہاتھ چٹیا کو اٹے سپیدھے بل دے رہے تھے..... پر اس کا احساس تو خود اسے بھی نہیں تھا تو کسی دوسرے کو کیا ہوتا۔



”بس.....؟“ آخری بل جلتے دیکھ کر سونو نے پوچھا۔

”ہاں بس.....!“ اماں بچتے بچتے تھکے ہوئے بازو کو ہلکا ہلکا دباتے ہوئے کہا۔ سونو نے اس کی گود سے سگٹھا اٹھا لیا۔

”روٹی پک گئی کیا.....؟“ اماں نے اس سے پوچھا۔

”میں اماں سے پوچھ کے آتا ہوں.....“ سونو نے اسے اطلاع دی۔

”نہیں، ماں سے مست پوچھنا وہ ناراض ہوگی.....“ تو خود باورچی خانے میں جا کے دیکھ کوئی روٹی بنا رہا ہے۔“ اماں بچتے بچتے سے ٹوکا اور کہا۔ دوپہر کا کھانا سلائی سیکھنے والی لڑکیاں ہی باری باری پکایا کرتی تھیں۔

”اچھا میں دیکھ کر آتا ہوں۔“ سونو غراب سے ایک بار پھر گھر کے اندر غائب ہو گیا اماں نے پیسوں کے ڈبے میں ایک بار پھر جھانک کر دیکھا بھوک کے وقت پیسے گنتا بڑا مشکل کام تھا۔

”تو نے کچھ دیکھا شریف.....؟“ شریف لقمہ منہ میں رکھتے رکھتے رک گیا۔

”کیا.....؟“

”تو نے کچھ دیکھا ہی نہیں.....؟“ بختاور کچھ مایوس ہوئی۔

”کہاں.....؟“ شریف نے کچھ بے چارگی سے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ اسے اب بھی کچھ نظر نہیں آیا تھا۔

”کھڑکیوں کو دیکھ.....“ بختاور نے جیسے اسے گامیڈ کیا اور شریف نے آخر کہا۔

”یہ پردے کہاں سے آئے.....؟“

”ایچھے ہیں ناں.....؟“ بختاور بے اختیار خوش ہوئی۔

”ہاں، اچھے ہیں..... پر کہاں سے آئے.....؟“

”میں خرید کر لائی ہوں..... لٹڈ بازار سے۔!“

”تھرے پاس پیسے کہاں سے آئے.....؟“

”وہ تو بے کپڑوں کے لیے دیے تھے نا اس.....“

پردے خرید لیے میں نے.....“ شریف نے لقمہ پلیٹ میں رکھ دیا۔

”عید آ رہی ہے، تجھے اس لیے کپڑے بنانے کے لیے دیے تھے.....“ وہ ناراض ہوا۔

”جہاں دو عیدیں نئے کپڑوں کے بغیر گزر گئیں وہاں ایک اور سکی..... کیا فرق پڑتا ہے۔“ رتو فکر نہ کر

میں نے بچوں کے لیے عید کے کپڑے خرید لیے ہیں.....“ بختاور نے اطمینان سے کہا۔

”دو سال سے ایک بار بھی ہم عید نہیں مناتے تھے۔“ شریف نے کچھ اداسی کے ساتھ کہا۔

”سینما کی فلم تو ایک بار بھی کہیں گھومنے نہیں گئے.....“

”سب سے پہلے جاتے تھے سائل سمندر پر چھٹی کے دن.....“

”نئی باتیں کرتے تھے ہم وہاں بیٹھ کر“ بختاور بھی لڑا س ہونے لگی۔

”ماں کو روئے کھاتے تھے.....“

”اور اونٹ کی سیر.....“ بختاور نے قلمہ دیا۔

”اور وہ پھولوں کا بھرا جوتو ہمیشہ لیتی تھی۔“ بختاور شرماتا کر کہیں۔

”دونوں کو کچھ دیر پیپ پیٹھے رہے پھر شریف نے کہا۔

”اب وہ سائیکل بھی نہیں جس پر تجھے بٹھا کر کہیں ساتھ لے جاؤں۔“

”اور اسے قاتلو پیسے بھی نہیں کہ ان ساری چیزوں پر ضائع کر دیں۔“

”اور وقت بھی تو نہیں ملتا کہ میں اور تو دو گھڑی بیٹھ کر دکھ سکھ کی بات کر لیں۔“ شریف پھر اداس ہونے لگا، بختاور کی آنکھوں میں ہلکی سی آنی پھر وہ یک دم اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

”میں بھی پتا نہیں کہاں کے قصے لے کر بیٹھ گئی، منے کو دو دو دینا تھا..... اور تو نے روٹی کیوں چھوڑ دی.....“

”لا کر دیا تجھے.....“

”بڑی ہی کوڑہ مغز ہو گئی ہوں.....“

”کھانا آ گیا اماں.....“ سونو نے چبکتے ہوئے اعلان کیا۔ ایک پلیٹ میں روٹی رکھے اور اسی پلیٹ کے

کونے میں سالن کی ایک کٹوری رکھے وہ بڑی احتیاط سے دلہیز برنمودار ہوا تھا..... اماں بچتے ایک بار پھر حال

پس واپس آ گئی تھی۔

”لا میرے محل.....“ روٹی دے مجھے.....!“ اماں نے کچھ بے خبری اور خوشی سے کہا۔ روٹی اور چائے یا گھر

سے کی دوسری کھانے والی شے کا ملنا پورے دن میں اس کے لیے خوشی کے سب سے بڑے لحاظ تھے۔ سونو نے پلیٹ اسے تھادی اماں نے پلیٹ ساٹھنے پر رکھ

دی۔

”ہاتھ تو دھلا میرے.....“ اماں نے سونو سے کہا۔

”اور کیا اور چنر کچھ من پانی کے ایک گلاس کے ساتھ دے دو.....“

”جیل بس کر دھل گئے۔“ اماں نے اپنی قمیص کے

لب کوٹنے سے ہاتھوں کو خشک کرتے ہوئے کہا۔

”لب کو اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ سونو گلاس ہاتھوں میں لے

دلہیز پر بیٹھ گیا گلاس ابھی آدھا بھرا ہوا تھا یہ باقی کا

لی اماں کھانا کھاتے ہوئے بیتی تھی۔

”سے گا کہ آئے اماں.....؟“ سونو کو یک دم

اداسی میں دیکھی پیدا ہوئی۔ اماں روٹی کا لقمہ ہاتھ میں ملائے آلوؤں کے شوربے میں سے گوشت کا کوئی

کڑا اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بچتے میں ایک دن گھر میں بڑا گوشت پکتا تھا اور آج وہی دن کٹوری کی تہ میں گوشت کے چند ریٹے اور کچھ

کے دوران اس نے سونو کو بتایا۔

”میں پیسے انہوں.....؟“ سونو نے فوراً پیش کش کی۔

”نہیں.....“ سبے پرکتی ہوتی ہے اس سے.....“ رات کو ہی گئیں گے.....“ جب دکان بند کروں گی.....!“

اماں نے اسے بے اختیار روکا۔

”میرے سامنے گنتا اماں.....“ میں نے دیکھا ہے

”کھانا کیسے ہوتا ہے۔“ سونو نے مصحوبیت سے

کہا۔ شوربے میں متحرک اماں کی انگلیاں ساکت ہو

گئیں۔

”یہ فریج پر آمدے میں کیوں رکھ دیا ہے

بچتے.....؟“ شریف گھر میں آتے ہی چونکا تھا۔ ڈرائنگ

روم میں موجود واحد صوف اور میز پر آمدے میں پڑے

تھے۔

”اب یہ برآمدے میں ہی رہے گا.....“ اس کے

بچے آئی بختاور نے اطمینان سے کہا۔

”کیوں.....؟“ شریف نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

”کیونکہ میں نے برآمدے کو ڈرائنگ روم بنا دیا

ہے اور ڈرائنگ روم بچوں کو دے دیا ہے۔“ بختاور نے

بتایا۔

”کیوں، بچوں کے بستر برآمدے میں لگا دیتی.....“

وہ تو وہاں بھی آرام سے سو سکتے تھے۔“ شریف نے

اعتراض کیا۔

”لو، میں اپنے بچوں کو برآمدے میں ملاؤں گے

مہمان تو گھٹے دو گھٹے کے لیے آتے ہیں ان کو کیوں

نہ برآمدے میں بٹھاؤں۔ میرے بچے رات کو برآمدے

میں سوئیں اور انہیں ٹھنڈ لگ جائے تو کون ڈنٹے دار

ہے۔“ بختاور نے براہمان کر کہا۔

”جیل اچھا کیا تو نے.....“ تیرا گھر ہے تو جو چاہے

کر.....“ مہارانی ہے تو اس گھر کی.....“ شریف نے ہنس

کر اس کی عقل دور کرنے کی کوشش کی اور اندر چلا گیا۔

”ہاں یہ تو ہے.....“ گھر تو میرا ہی ہے.....“ مہارانی تو

میں واقعی ہوں یہاں کی.....“ بختاور نے بڑے غریب

مہمانانہ انداز میں کہا۔

www.aksociety.com

2009 مئی

59

ماہنامہ پاکیزہ

www.aksociety.com

2009 مئی

59

ماہنامہ پاکیزہ



کہتے ہیں، فخر یہ کہ میں مسلمان ہوں۔

"ہاں، وہی یہ کہ میں پہلے سے یہ کہتا رہا تھا۔  
 ہر ایک کو یہ کہنا چاہیے کہ میں اس سے پہلے  
 ٹھنڈ ہو گیا تھا۔  
 'ہاں' کھاتی ہوں میں۔' ماں بچتے سے پہلے  
 بے دلی کے ساتھ کہا۔  
 'ماں میں کچھ نیچے بڑی رکھ دوں۔  
 سناں سے' سوچو کہ ایک ہم چاہیں یا جیسا  
 تھا۔

یوں کہ اس سے قیود و حدود کے بغیر

میں نے اس کے لئے ایک خط لکھا ہے۔

والد تیرے سانس میں ہونی چاہئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سانس لینا ہے۔

فوراً کہی اور چنانچہ کنور باپ کے سامنے رکھ دیا۔ شریف نے اس کی بات پر ہنستے ہوئے چٹا تھریا سا ساں اس کنور کے منہ میں ڈال دیا تھا۔

برتن میں بچے ہوئے ٹھوڑے سے تھوڑے بچے میں اپنی روٹی  
لگا لگا کر کھانے لگا تھا۔

● ● ●

’اے، میں بوٹی، کر دوں امام‘ ”سو نہ۔“  
’بس کے ہاتھ سے سائیں، برتن پیسے کی کیشش

پڑتے روئے ہو گئے ہیں جاں ؟ سو لوے  
 پلیٹ پکڑتے وہ لئے اس سے گہر۔  
 ”بھوک نہیں ہے سو لو“ نام سے اوس سے  
 پانی کا گلاس پکڑ لیا۔  
 ”بھوک نہیں ہے“ ؟ ”سو لوے پوچھا۔  
 ”اس عمر میں بھوک نہیں لگتی“  
 ”سو لو“

پولیس پیر

ہاں نقشہ بنا کر دوبارہ گھر بنا میں گئے۔ ”

61 مضمونہ پاکیرہ

میں نے۔۔۔“  
 ”اور ٹی وی بھی۔۔۔“ دونوں کو ایک کے بعد  
 ایک چیزیں یاد آ رہی تھیں۔  
 ”اور پھر ہم دونوں بڑھا بڑھی سارا دن  
 پوتے پوتیوں کے ساتھ کھیل کر رہے۔“ شریف نے

ہمارے خد متیں کرتے پھریں گے اپنی اور  
 میں تو بھر سارا اس آرام سے مکی نام کر سون

”مسلم اماں بنتے...“ وہ سترہ اشہدہ سہاں کا ایک  
جو ان لڑکا تھا اماں بنتے نے چونک کر اسے دیکھا۔

کے عیالک سید کی کمرے ہوئے میں وہ بچپانے کی کوکھ











بات کر رہا تھا جسے خریدنے اور ہانے میں اس کی ساری جوانی چلی گئی تھی۔ وہ گھر آگیا۔ یہ بات وہ انہیں سمجھا نہیں پا رہی تھی۔ یہ بات کوئی بھی مرد نہیں سمجھ سکتا۔

”اماں، میں جیلی لے لوں۔۔۔؟“ سونو نے اسے ایک بار پھر چونکا یا۔ وہ منہ کھول کر جمائی لیتے ہوئے کھانے پینے کے ڈیوں میں پڑی چیزوں پر نظر ڈال رہا تھا۔

”جیلی کیا۔۔۔؟“ ایک لمحے کے لیے اماں بختے کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔

”یہ والی جیلی۔۔۔“ سونو نے جیلی کا پیکٹ پکڑ کر اس کے سامنے لہرایا وہ اماں بختے کی دکان کا سب سے مہنگا آٹم تھا۔

”ساری جیلی کھائے گا۔۔۔؟“ اماں کچھ گریزاں ہوئی۔

”ہاں بھوک لگ رہی ہے۔“ سونو نے کہا۔

”تو بیکٹ کھالے۔“ اماں نے بیکٹ کا ایک پیکٹ اٹھایا۔

”نہیں، مجھے تو جیلی ہی کھانی ہے۔ بس جیلی ہی۔۔۔۔۔ مجھے جیلی ہی کی بھوک ہے۔“ سونو نے دو ٹوک انداز میں اماں سے کہا۔

”اچھا چل لے لے۔ بڑی ضد کرنے لگا ہے اب تو سونو۔“ اماں نے فوراً اس کے سامنے کھٹے عکیتے ہوئے جیلی کا پیکٹ اسے تھما دیا تھا۔ سونو کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ اس نے اماں کے تھمرے پر بھی غور نہیں کیا۔ وہ بس خوش خوش جیلی کا پیکٹ کھولنے میں مصروف تھا۔

اماں نے ذرق برق کپڑوں میں ہنوس کچھ بچوں کو اپنے سامنے سے گزر کر گلی کے ایک گھر میں جاتے دیکھا۔ شاید بڑی گلی کے کسی گھر میں شادی تھی کیونکہ بہت دور سے باجوں کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔

”اماں میں دو لہا دیکھوں گا۔“ سونو نے یک دم کھڑے ہو کر اعلان کیا۔ باجوں کی آواز اس نے بھی سن

لی تھی۔

”اماں سے پوچھ کر چاہتا ہوں۔“ اماں بختے نے اسے اسے روکنے کی کوشش کی۔

”اماں کو رہنے دو۔“ سونو تقریباً پھاگتا ہوا کہتا چلا گیا تھا۔ محلے کے کچھ اور گھروں سے بھی بچے اور کچھ عورتیں نکل کر بڑی گلی کی طرف کئی تھیں، باجوں کا شور اب بہت زیادہ اور بہت قریب آ رہا تھا۔ اماں جاسکتی تو اس وقت وہ بھی گلی کے موڑ پر کھڑے مجمع میں شامل ہوتی جو بڑی گلی سے گزرنے والی بارات کو دیکھ رہا تھا۔

دس چندرہ منٹ کے بعد باجوں کا شور کم ہونے لگا پھر آہستہ آہستہ اس مجمع میں موج و زور آگیا۔ سونو نے اپنے اپنے گھر کو واپس ہونے لگی۔ اماں سونو کی منتظر تھی چند منٹوں بعد اس کے بالآخر سونو کو نمودار ہوتے دیکھ لیا۔

اماں نے اٹھنا کی سانس لی۔

”دیکھ لی بارات؟“ سونو کے قریب آتے ہی اس نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔“ سونو نے قدم سے پر جوش انداز میں کہا۔

”دو لہا بھی دیکھا۔۔۔؟“ اماں بختے نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

”ہاں دو لہا بھی دیکھا۔۔۔!“ سونو نے سر ہلایا۔

”اماں میری شادی کب ہوگی۔۔۔؟“ سونو نے یک دم اماں سے پوچھا۔ اماں کو ہنسی اور کھانسی کا دورہ پڑا۔

”شادی کرے گا تو۔۔۔؟“ اماں نے دو ٹوک جواب دیا۔

”پاتے گی کوشش کی۔“

”ہاں۔۔۔!“ سونو بے چین تھا۔

”اچھا میں کہتی ہوں تیری ماں سے۔۔۔۔۔ کہ لڑکی ڈھونڈ لے تیرے لیے۔“ اماں بختے نے ہنستے ہنستے کہا۔

”لڑکی کیوں ڈھونڈے؟“ سونو چونکا۔

”لے لڑکی کے بغیر ہی شادی کر لے گا؟“ اماں کو ہنسی اور کھانسی کا ایک اور دورہ پڑا۔

”پر اماں میں نے تو تیرے ساتھ شادی کر لی ہے۔“ سونو نے اسی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ اس بار اماں کو

کچھ نہیں کہتی ہوں تیری ماں سے۔۔۔۔۔ کہ لڑکی ڈھونڈ لے تیرے لیے۔“ اماں بختے نے ہنستے ہنستے کہا۔

”لڑکی کیوں ڈھونڈے؟“ سونو چونکا۔

”لے لڑکی کے بغیر ہی شادی کر لے گا؟“ اماں کو ہنسی اور کھانسی کا ایک اور دورہ پڑا۔

”پر اماں میں نے تو تیرے ساتھ شادی کر لی ہے۔“ سونو نے اسی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ اس بار اماں کو

مہل کھانسی کا دورہ پڑا تھا، مزید ہنسنے کی ہمت نہیں تھی۔

”سونا میں تو بڑی ہی ہوگی ہوں۔۔۔!“ اماں نے ہنسی اور کھانسی دونوں پر قابو پا لیا تھا۔

”کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔“ سونو کی سنجیدگی برقرار تھی۔

”اچھا پھر کیا کرے گا؟“ اماں بختے نے پوچھا۔

”پھر میں اپنے سارے پیسے بچھے دے دوں گا۔۔۔۔۔“

”ابا، اماں کو دے دیتا ہے۔۔۔۔۔ میں بھی ساری چیزیں لے لاکر دوں گا۔۔۔۔۔“ اماں کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

”اس نے بمشکل پوچھا۔

”تا کہ تجھے کھانا ہو۔۔۔۔۔“ سونو نے جواب دیا

اماں کی آنکھیں سنبھلنے لگی تھیں۔

”عہد کی شادی کر دیتے ہیں بختے۔“

”اور شریف کی اس بات پر جیسے کرٹ کھا کر اچھلی گئی۔

”اماں نے گہری سانس لے کر کہا۔

”وہ بھی مجھ سے کوہت بچنے کی ہمد کر رہا ہے۔“

”ہاں کر دیں گے تو بیوی روک سکتے تو بیوی کیسے روک لے گی اسے۔“

”اماں کو دھتے گوندتے بختا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”اماں کو ہنسی اور کھانسی کا دورہ پڑا۔

”شادی کرے گا تو۔۔۔؟“ اماں نے دو ٹوک جواب دیا۔

”پاتے گی کوشش کی۔“

”ہاں۔۔۔!“ سونو بے چین تھا۔

”اچھا میں کہتی ہوں تیری ماں سے۔۔۔۔۔ کہ لڑکی ڈھونڈ لے تیرے لیے۔“ اماں بختے نے ہنستے ہنستے کہا۔

”لڑکی کیوں ڈھونڈے؟“ سونو چونکا۔

”لے لڑکی کے بغیر ہی شادی کر لے گا؟“ اماں کو ہنسی اور کھانسی کا ایک اور دورہ پڑا۔

”پر اماں میں نے تو تیرے ساتھ شادی کر لی ہے۔“ سونو نے اسی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ اس بار اماں کو

کچھ نہیں کہتی ہوں تیری ماں سے۔۔۔۔۔ کہ لڑکی ڈھونڈ لے تیرے لیے۔“ اماں بختے نے ہنستے ہنستے کہا۔

”لڑکی کیوں ڈھونڈے؟“ سونو چونکا۔

”لے لڑکی کے بغیر ہی شادی کر لے گا؟“ اماں کو ہنسی اور کھانسی کا ایک اور دورہ پڑا۔

”پر اماں میں نے تو تیرے ساتھ شادی کر لی ہے۔“ سونو نے اسی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ اس بار اماں کو

ابھی تو غفار نے وہ رقم تک واپس نہیں کی جو گھر گروی کر رکھے اسے دی تھی۔۔۔۔۔ جہاں بھی کوئی پیسہ نہیں بھیج رہا۔۔۔۔۔ بختا ورنے بے حد تشویش کے ساتھ کہا تھا۔

”جہاں اتنا گھانا۔۔۔۔۔ وہاں کچھ اور سبکی۔۔۔۔۔ کچھ اور روپیہ ادھار لے لوں گا میں۔۔۔۔۔ شادی ساوگی سے کر لیں گے۔“ شریف نے کہا۔

”دیکھ شریف میری بہو کا دوپٹا۔“ بختا ورنے بڑی خوشی خوشی ایک سرخ دوپٹا شریف کے سامنے پھیلا یا جس پر وہ گونا گوارہی تھی۔ شریف تھوڑی دیر پہلے ہی کچھ سامان لے کر کمرے میں آیا تھا اور اب اپنے جوتے اتار رہا تھا اس نے بڑے بے تاثر انداز میں کہا۔

”اچھا ہے۔۔۔۔۔“ بختا ورنے اس کے بچھے ہوئے لمبے پر غور کیے بغیر کہا۔

”بس آج رات مکمل کر لوں گی اسے، چاہے ہوا ت جاگتا ہی کیوں نہ پڑے مجھے۔“ بختا ورنے ایک بار گھر دے پر گونا گوارہ لے لی۔

”میں سوچ رہا ہوں ہم یہ کمر ابدال اور اس کی دوہن گوندے دیں۔“ شریف نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔۔۔۔۔ بختا ورنے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟ اپنا کمر ابدال کو دے دیں۔۔۔۔۔ تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ وہ ناراضی سے کہہ کر دوبارہ گونا گوارہ لے لی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ ذرا اچھا کمر ہے۔۔۔۔۔ بڑا بھی ہے۔“ شریف نے کہا۔

”عہد کا کمر بھی اچھا ہے۔“ بختا ورنے دوبارہ کہا۔

”یہ ذرا زیادہ اچھا سجا ہے۔“ شریف نے کہا۔

”میں عہد کے کمرے کو بھی اچھی طرح سجا دوں گی رضیہ کے سامان سے تو فکر نہ کر۔“ بختا ورنے اس کی بات کاٹی۔

”پھر بھی میں۔۔۔۔۔“ بختا ورنے اس بار پھر اس کی بات کاٹی۔

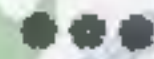
”میں تو اپنا کمر ابھی نہیں چھوڑوں گی۔۔۔۔۔ چاہے







کر کر کے میں اور تو مر جائیں گے.....“ رضیہ بھی اب اندر سے آگئی تھی۔  
 ”تو ٹھیک ہے ابا اس بار وہ گردی والے پیسے مانگتے آئیں گے تو میں کہہ دوں گا ان سے کہ مکان پر قبضہ کر لیں وہ.....!“ عبدل نے باپ کو دھمکایا۔ شریف نے سر اٹھایا اور باورچی خانے میں آنسو بہاتی بخٹاور کو اس نے دیکھا پھر شکست خوردہ انداز میں عبدل سے کہا۔  
 ”تو کاغذ بنوالے، تیرے نام کر دیتا ہوں میں یہ گھر۔“ رضیہ نے یک دم فاتحانہ انداز میں باورچی خانے میں دوپٹا آنکھوں پر رکھ کر روتی ساس کو دیکھا اور اندر چلی گئی۔

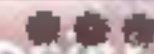


”تو نے گھر عبدل کے نام کر کے اچھا نہیں کیا، جبار اور غفار کو پتا چلے گا تو کتنا ہنگامہ اٹھائیں گے وہ۔“ آخر ان کا بھی حصہ تھا اس گھر میں.....!“ بخٹاور نے بے حد رنج کے ساتھ شریف سے کہا۔ وہ دونوں بے حد مدہم آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ نہیں جانتے تھے کہ ان کی کوئی بات سن کر بیٹا یا بہو طوفان اٹھائیں۔  
 ”یہ گھر نہیں کھانا ہے بختے..... اور کھانے میں کسی کا حصہ نہیں ہوتا۔ کھانا پورے کا پورا کسی ایک کے حصے میں آتا ہے۔“ شریف نے تسبیح کے دانے بھیجرتے ہوئے کہا۔ بخٹاور بھبک کر رو پڑی۔

”گھر کھانا کیسے بن جاتا ہے شریف.....؟“  
 ”گھانا کھانے والا آدمی کیسے جواب دے اس کا..... یہ سمجھ آ جائے تو آدمی کھانا کیوں کھائے۔“ شریف آج بے حد ادا تھا۔ بخٹاور نے یک دم اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”تو لیٹ جا شریف..... تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ بخٹاور نے اپنی چادر سے آنکھیں رگڑ کر کہا۔ شریف بے حد رنج کے عالم میں اس کا چہرہ بہت دیر تک دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

”اب لیٹنا ہی ہے بختے۔ کھانا کھا کھا کر اب لیٹنا ہی ہے۔“ بخٹاور کا دل جیسے کسی نے منھی میں لے لیا۔



”باپ کی موت کا سنتے ہی دونوں بیٹے باہر سے آگئے۔“  
 بڑی سعادت مند اولاد ملی بھائی شریف کو۔ اللہ ایسی اولاد سب کو دے۔“ صحن میں تعزیت کرنے والی عورتیں بیٹھی ایک دوسرے سے باتیں کر رہی تھیں۔ دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھی بخٹاور کے کانوں میں جبار اور غفار کی آوازیں گونج رہی تھیں۔  
 ”ابا نے جیتے جی ہمارے ساتھ انصاف نہ کیا تو مر کر کیسے کرتے.....!“ یہ جبار تھا۔  
 ”ارے، پوری کی پوری جائیداد چھوٹے کے نام کر دی یوں جیسے اکلوتی اولاد ہو وہ ابا کی۔“ غفار نے حلق کے بل چیخ کر کہا تھا۔

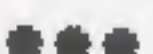
”اور ایک ہم ہیں کہ پاگلوں کی طرح دوڑنے آئے باپ کے جنازے کو کاندھا دینے کے لیے۔ کاروبار بند کر کے جہاز کے کرایے پر بھی پیسہ برباد کیا ہم لوگوں نے۔“ شریف کی تدفین کے فوری بعد دونوں بڑے بیٹوں نے مکان اور دکان میں اپنے حصے کا مطالبہ کر لیا تھا اور یہ مانگتے ہوئے کہ وہ دونوں چیزیں غفار بہت پہلے عبدل کے نام کر چکا تھا۔ وہ دونوں آگ بھڑکے ہوئے تھے۔

”میں تو اب دوبارہ اس گھر میں قدم تک نہیں رکھوں گا۔“ جبار نے اعلان کیا تھا۔

”ارے جس گھر میں حصہ تک نہیں ہمارا وہاں بھی کیوں رہیں ہم اپنا.....!“

”جو کچھ تو نے ہمارے ساتھ کیا ہے اماں.....“  
 ”لے آج ابا نہیں تو بھی مر گئی ہمارے لیے۔“ بخٹاور یک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”ارے صبر کر اماں..... دکھ بڑا ہے پر صبر کر دیکھ تیری اولاد جانے والا جو چھوڑ کر گیا ہے وہ حیرت لپے۔“ ایک عورت نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا تھا۔



دوپٹے سے اماں بختے نے اپنی آنکھیں رگڑیں دس سال ہو گئے تھے شریف کو گئے پر ہر بار وہ اسے دیکھتا تھا۔

انا تھا تو دل بھرا آتا تھا۔

دوسرے عبدل جوتے نہیں آ رہا تھا۔ اماں اب اس کی آواز تک پہنچاتی تھی۔ وہ یک دم سیدھی ہو کر رہ جاتی تھی۔

”آگیا بیٹا.....!“ اس نے عبدل کے قریب آنے پر کہا۔ عبدل کے ہاتھ میں پھلوں کا لفافہ تھا۔ دہلیز میں اس کے نمودار ہوتے ہی سونو بھاگتا آگیا تھا۔ عبدل نے اماں کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس کی پوری توجہ چار سالہ سونو پر تھی جو اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر اب اس لفافے کو اس کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔

”لے، چھین کیوں رہا ہے۔ تیرے لیے ہی لایا ہوں..... تیرا ہی ہے سب کچھ۔“ عبدل لفافہ سونو کے اندر میں پکڑاتے ہوئے اندر چلا گیا۔ اماں بیٹھی کی بیٹھی رہ جاتی تھی۔



”تجھ سے ایک بات کرنی ہے اماں۔“ عبدل لہجے میں ایسی مٹھاس کتنے دنوں بعد سنی تھی اس نے۔  
 ”ایک دم تجھ کو کچھ کر بیٹھ گئی۔“

”ہاں..... ہاں..... بول بیٹا۔“ عبدل اس کی پالی پر بیٹھ گیا تھا۔

”بچے بڑے ہو رہے ہیں ہمارے..... اور گھر بڑا آتا ہے۔“ عبدل نے تمہید باندھنی شروع کی۔

”ہاں گھر تو چھوٹا ہے۔ چار بچوں کے ساتھ آسانی سے تو گزارہ نہیں ہوتا..... پر تو فکر نہ کر میں اللہ دعا کروں گی تجھے اور رزق دے اتنا پیسہ دے کہ تو کسی ایک کمرہ بنا لے۔“ اماں کا خیال تھا وہ دعا لینے آیا تھا۔

”رزق اور پیسہ تو جب آئے گا آئے گا..... فی الحال تو میں یہ چاہتا ہوں کہ تو برآمدے میں سو جایا اس کمرے میں بچوں کو رکھنا چاہتے ہیں۔“ عبدل کے لہجے میں اس بار ٹھنڈک تھی۔

”برآمدے میں تو صوف.....“ بخٹاور نے کچھ کوشش کی۔ عبدل نے اس کی بات کاٹ دی۔  
 ”صوف وہیں رہے گا..... دن کے وقت رضیہ تجھے



